عبدالکریم سروش - ایران کے لیے عظیم سیاسی چیلنج

رابن رائٹ☆

کیا اسلام اور جمہوریت ہم آہنگ ہیں ؟ کیا ایسے توحیدی مذہب میں، جس کے قوانین بیک وقت معاشرے کو کنٹرول بھی کرتے ہیں اور اعتقادات کا مجموعہ بھی ہیں، سیاسی تکثیریت کی گنجائش ہے ؟ کیا انفرادی انسانی حقوق، مساوات اور انتخاب کا حق، ایسے ایمان اور اعتقاد کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتے ہیں، جس کا مطلب ہی اطاعت اور حوالگی ہے ؟

یونیورسٹی کیمپس، قہوہ خانوں، اخبارات کے دفاتر، آج کل تہران میں ہر جگہ عبدالکریم سروش کے خیالات مباحث کا مرکزی موضوع ہیں۔ سروش جو انقلاب کے زمانے میں منظر عام پر آئے تھے، ان کے نظریات اندرونی طور پر ایران میں عظیم سیاسی چیلنج کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ انہوں نے ایرانی قائدین کو اس حد تک ناراض کر دیا ہے کہ گزشتہ سال [۱۹۹۴ میں] امریکی اسمبیسی کی بندش کے ۱۷ ویں سال کی تقریبات کے موقع پر انہوں نے ''بڑے شیطان'' امریکہ اور اسرائیل سے بھی زیادہ سروش کو برا بھلا کہا۔ بلکہ انہیں انصار حزب اللہ کے نوجوانوں کی طرف سے دھمکیوں اور مار پیٹ کا نشانہ بھی بنایا گیا ہے۔

بنیاد پرست نہیں، اسلامی

سروش درحقیقت معروف ایرانی فلاسفر ڈاکٹر حسین دباغ (Dr Hosein Dabbagh) کا قلمی نام ہے۔ اگرچہ انہوں نے اسلامی قانون اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے، سروش [روایتی] ملا نہیں ہیں، انہوں نے ایک ایسے اعتقاد کی بنیادیں ہلا دی ہیں جس کے کروڑوں پیروکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تقابل ۱۹ ویں صدی کے جرمن مصلح مارٹن لوتھر سے کیا جانے لگا ہے، جو عیسائیت سے منحرف ہو گئے تھے۔ یہ تقابل گزشتہ دہائی میں ان کے کام کی بنا پر کیا جاتا ہے، جس نے تیرہ صدیوں کے روایتی اسلامی انداز فکر کو چیلنج کر دیا

☆Robin Wright, "Iran's Greatest Political Challenge: Abdol Karim Soroush", *World Policy Journal*, Summer 1997, pp. 64-67 (تلخیص: سید راشد عاری)

ہے۔ خصوصاً سیاسی اور انسانی حقوق اور جدید ریاست میں اسلام کے کردار کے حوالے سے صرف ایران یا اسلامی ریاست میں ہی نہیں بلکہ باہر بھی حالیہ رواجات پر سوال اٹھا کر وہ نہ صرف سیاسی تبدیلی بلکہ مذہبی اصلاح کے لیے بھی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ ایران، ہمسایہ عرب دنیا اور ۷۰ قومی ''اسلام کی جنت'' کے دیگر ممالک میں مختصر لیکن بڑھتے ہوئے دانشوروں کے ساتھ سروش ایک ایسا تصور عالم (World view) پیدا کرنے کے عمل سے گزر رہے ہیں، جو درحقیقت اسلامی بھی ہے اور جدید بھی۔ یعنی بنیاد پرست ہوئے بغیر اسلامی۔

ان کی زیادہ بروقت تحریریں ـــــ ایران کے مستقبل اور اسلامی ممالک اور مغرب کے مابین تعلقات کے لیے ـــــ جمہوریت کے بارے میں ہیں۔ مشرق وسطیٰ نے اس طرح کی سیاسی تبدیلی کی مزاحمت کی ہے، جیسی تبدیلی ۱۹۸۰ء سے مشرقی یورپ، لاطینی امریکہ، افریقہ اور ایشیا میں آئی ہے۔ انڈونیشیا سے سعودی عرب، سوڈان سے نائجیریا تک مسلم اکثریتی ممالک دنیا کی باقی رہ جانے والی مطلق العنان حکومتیں ہیں۔ کیونکہ اکثر اسلامی ممالک میں جمہوریت کی نمو سست رہی ہے۔ سرد جنگ کے بعد کی روایتی دانائی کے مطابق آئندہ کشمکش اسلامی دنیا اور مغرب کے درمیان ہے۔

لیکن سروش اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا ''اسلام اور جمہوریت نہ صرف ہم آہنگ ہیں بلکہ ان کا تعلق ناگزیر ہے''۔ مسلم معاشرے میں کوئی شخص دوسرے شخص کے بغیر مکمل نہیں ہے۔ ان کے دلائل دو بنیادوں پر ہیں۔ پہلی یہ کہ ''ایک سچے مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ آزاد ہو۔ کسی دباؤ کے تحت لایا گیا ایمان درست نہیں ہے۔ اور یہی آزادی جمہوریت کی بنیاد ہے''۔

عالمی انسانی حقوق کے حوالے سے بھی اسی طرح کی منطق کا اطلاق ہوتا ہے۔ ''انسانی حقوق کا نظریہ تو پہلے سے ہی مذہب میں موجود ہے''۔ صرف جمہوریت ہی ایسی حکومت ہے جو انسانی حقوق کی ضمانت دیتی ہے۔ ''مسلم دنیا میں ہم صرف فرائض کی بات کرتے ہیں حقوق کی نہیں۔ جبکہ جدید تہذیبوں میں، خدا پر ایمان لانا آپ کا فرض نہیں ہے بلکہ آپ کا حق ہے۔''

ان کے دلائل کی دوسری بنیاد مقدس کتابوں کی انسانی تفہیم پر ہے۔ بائبل (جس پر مسلمان بھی ایمان رکھتے ہیں) اور قرآن کے متن میں تبدیل ممکن نہیں ہے۔ لیکن سروش کے مطابق ان کے متن کی تشریح میں بدلتے ہوئے وقت اور انسانی حالات کے زیر اثر تبدیلی ہو سکتی ہے۔ وہ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں، ''ایک مخصوص تشریح ارتقا کو روک دے گی

اور مذہب گھٹن کا شکار ہو جائے گا . . . اور مذہبی ریاست اور معاشرے کی ترقی رک جائے گی"۔

ایمان کا حق

سروش کے مطابق، "مذہب کی کوئی بھی تفہیم حتمی اور مکمل تصور نہیں کی جانی چاہیے۔ مذہب کی کوئی سرکاری تشریح نہ ہو۔ بلکہ مختلف تشریحات میں تنوع ہونا چاہیئے۔ اور ایک آئیڈیل مذہبی ریاست کو اس آزادی کا تحفظ کرنا چاہیئے . . . ایک تکثیریت پسند مذہبی ریاست، جمہوریت کے زیادہ نزدیک ہے۔ نسبتاً مذہبی ریاست کے"۔

سروش کی تحریروں نے، حکومت اور خدا دونوں کے ساتھ تعلق کے ضمن میں فرد کے حقوق کو واضح کیا ہے، اور اکثریت کے لیے راستہ صاف کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ اعلیٰ حکومتی عہدے دار بتائیں کہ حقیقی آئیڈیل اسلامی ریاست کیا ہے"۔

مزید براں سروش سیاسی نظریے کے طور پر اسلام کی مخالفت کرتے ہیں، "جدید ریاست پر حکومت کے لیے، مذہبی نظریے کو استعمال نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے مطلق العنانیت جنم لیتی ہے"۔ مذہبی نظریات کے ذریعے حکومت چلانے سے، مذہبی علم کی نشوونما کے امکان محدود ہو جاتے ہیں۔ لوگ اپنے ذاتی انتخاب کی بنا پر مذہبی ہوتے ہیں نہ کہ حکومتی اختیار و اقتدار کے ذریعے۔

مسیحی اصلاحات کی طرز پر —— جب پروٹسٹنٹ، رومن کیتھولک چرچ سے علیحدہ ہوئے، —— سروش بھی مسجد اور ریاست کے کردار، طاقت اور ذمہ داریوں میں امتیاز کرتے ہیں۔ یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ مذہب فطری طور پر سیاسی ہے، وہ سیاست میں اس کی براہ راست مداخلت اور طاقت ور عنصر کے طور پر شمولیت کو مسترد کرتے ہیں۔ سروش یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگرچہ معاشرے کو چلانے کے لیے اس میں رہنما خطوط ہیں۔ لیکن اسلام جدید حکومت کے لیے واضح اصول اور بلیو پرنٹ مہیا نہیں کرتا۔

ایک ارتقائی مذہب

مارٹن لوتھر کے برخلاف سروش اعتقاد کی مرکزی اقدار کو رد نہیں کرتے، جو ان کے خیال میں حکومت پر اثر انداز ہو سکتی ہیں اور ہونا بھی چاہیئے۔ چونکہ اسلام کی تشریح ارتقا پزیر ہے اس لیے شریعت یا اسلامی قانون، جدید آئین سازی کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ شریعت ایک قابل توسیع چیز ہے اور اسلامی جمہوریت میں آپ اس کی تمام ممکنہ استعداد کو حقیقت کا روپ دے

سکتے ہیں۔ سروش اسلام کو ایسے مذہب کے طور پر دیکھتا ہے جو ابھی تک ارتقائی مراحل سے گزر رہا ہے۔

سروش واضح طور پر مذہبی حکومت (تھیوکریسی) کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ان ناقابل تغیر اور متشدد اصولوں کے خلاف دلیل دیتے ہیں جو مذہبی قائدین کو قانون سے بالا مرتبہ اور حیثیت عطا کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ایک مثالی مذہبی معاشرے میں کوئی شخصیت اور فتویٰ تنقید سے بالا نہیں ہوتا۔

ان کے تمام خیالات میں شائد یہی آخری نکتہ موجودہ حکومت کے لیے سب سے زیادہ مضمرات کا حامل ہے، کہ یہ ''ولایت فقیہ'' کے حتمی اختیار کو کم کرتا ہے۔ جو حیثیت آیت اللہ روح اللہ خمینی کو حاصل رہی یا اُن کی وفات (۱۹۸۹) کے بعد آیت اللہ علی خامنائی کو حاصل ہے۔ یہ دو اعلیٰ اختیاراتی مجلسوں ''کونسل آف گارڈینز'' اور ''کونسل آف ایکسپرٹس'' کے اختیارات کو بھی چیلنج کرتا ہے۔

بر سر اقتدار ملا سروش کو تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ وہ (سروش) مملکت کے اندرونی بااثر حلقے کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کی بنیاد اور نشو نما ایک مکمل انقلابی شخصیت کے لیے موزوں ہے۔ وہ تہران کے ایک اوسط درجے کے خاندان میں ۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئے، سائنس کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، دواسازی میں ڈگری حاصل کی، بعد میں تجزیاتی کیمیا اور فلسفہ سائنس میں گریجویشن کے لیے لندن چلے گئے۔ اسلامی فلسفہ پر ان کی پہلی کتاب ''دنیا کی بے چین فطرت'' (The Restless Nature of The World) تھی جس میں کائنات کی مستقل تغیر پزیری اور مادی دنیا میں وقت کی بطور چوتھی جہت (Fourth dimension) حیثیت کو موضوع بحث بنایا گیا تھا۔ اس کتاب نے آیت اللہ خمینی کی ذاتی منظوری بھی حاصل کی۔

سروش ان ہزاروں دانشوروں میں تھے جو انقلاب کے دوران ایران واپس لوٹے۔ انہیں ایک دین دار مفکر کے طور پر پہلے ہی تسلیم کیا جا چکا تھا۔ انہیں سات رکنی ''ثقافتی انقلاب کی کمیٹی'' کے لیے بھی نامزد کیا گیا تھا۔ جب نئی اسلامی حکومت نے تمام یونیورسٹیوں کو اس لیے بند کر دیا تھا تاکہ اسلامی خطوط پر تعلیمی نظام اور نصابات وغیرہ تیار کیے جا سکیں۔ ان کی زندگی کا یہ دور سب سے زیادہ متنازعہ ہے۔ کیونکہ سینکڑوں فیکلٹی اور سٹاف ممبران کو ایران کی یونیورسٹیوں سے نکال دیا گیا تھا۔

۱۹۹۰ء کی دہائی میں جب انہوں نے مغربی ممالک میں لیکچرز دیے تو جلاوطنی کے

دوران ان کی وابستگی کے حوالے سے ان پر بدترین الزامات لگائے گئے۔ انہوں نے یونیورسٹیاں دوبارہ کھلنے کے بعد ۱۹۸۳ء میں کمیٹی چھوڑ دی۔ تب انہوں نے تہران یونیورسٹی اور دو دیگر اعلیٰ تعلیم کے چھوٹے اداروں میں فلسفہ سائنس، فلسفہ تاریخ، فلسفہ مذہب اور جدید الٰہیات پڑھانا شروع کیا۔ جبکہ وہ ابھی انقلابی حکومت کے حق میں تھے انہوں نے ایرانی ٹیلی ویژن پر قرون وسطیٰ کے مشہور فارسی شاعر رومی پر لیکچر بھی دیے۔

نقطہ تغیر

حکومت سے ان کے اختلاف کا آغاز اس وقت ہوا جب سروش نے متنازعہ امور پر رائے دینے کا آغاز کیا، ان کے خیالات علمی حلقوں میں مقبول ہونے لگے۔ اور معاشرے کے بڑے دھارے ـــــ نوجوانوں، خواتین، سرکاری ملازمین اور علماء ـــــ میں نفوذ کرنے لگے۔

اسی کے عشرے کے اواخر میں جب عالمی سطح پر سیاسی تبدیلی کا عمل تیز ہوا، سروش نئی سیاسی اور مذہبی آزادیوں کی وسعت پذیر تحریک کے لیے، جس نے مسلم دنیا میں جڑیں پکڑنا شروع کر دی ہیں، ایک علامت کے طور پر سامنے آئے۔

ان کے سامعین میں ۱۹۸۸ء میں مزید اس وقت اضافہ ہوا جب انہوں نے مسجدوں میں ہر جمعرات کی شام لیکچر دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اکثر ہجوم اس قدر زیادہ ہو جاتا کہ جگہ کم پڑ جاتی۔ ۱۹۹۱ء میں ان کے حامیوں کے ایک گروہ نے ان کے پندرہ روزہ کالموں کے لیے ایک میگزین ''کیان'' شروع کیا۔ وہ ایک زود نویس اور معروف لکھنے والے ہیں۔ ان کی نیس سے زیادہ کتابوں میں سے اکثر کتابیں، جن کے عنوانات اس طرح کے ہیں، ''دانائی اور وجود''، ''محبت اور محکومی کی کہانی''، وغیرہ، اور جو فارسی شاعری سے نظریات (آئیڈیاز) کی تاریخ تک کا احاطہ کرتی ہیں، کئی کئی بار شائع ہو چکی ہیں۔

حکومت، خصوصی طور پر نوجوانوں میں سروش کی مقبولیت سے پریشان ہے، وہ نسل جو انقلابی حکومت کے دور میں ہی پروان چڑھی اور جس نے بادشاہت کا دور نہیں دیکھا جس سے اس کا موازنہ کیا جا سکے۔

اشیائے صرف کی کمیابی، مہنگائی، ملازمتوں کے محدود مواقع، رہائش کی سہولتوں کا فقدان، سخت سماجی پابندیاں، تفریح کے محدود مواقع اور پیشہ ورانہ زندگی سے باہر عوام میں غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کے ملنے جلنے پر پابندی، ایسے عوامل ہیں جنہوں نے بے اطمینانی میں گہرا اضافہ کیا ہے۔ کمزور معیشت اور مغرب کے لیے ویزوں کے حصول میں

دشواری کے باوجود، ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لاکھوں ایرانیوں نے باہر کی دنیا تک سیٹلائٹ ڈش کے ذریعے رسائی حاصل کرلی ہے۔ ڈش کے ذریعے انہیں ہر چیز سے واقفیت ہو گئی ہے، چاہے وہ ''بے واچ'' ہو یا ''اوپیرا''، ''ایشیائی VH-1'' ہو یا ''راک ویڈیو چینل''۔ ایرانی پارلیمنٹ نے ۱۹۹۵ء میں ڈش پر پابندی لگائی تھی لیکن اس کو مکمل طور پر ختم نہیں کیا جاسکا۔

سٹیٹس کو (status-quo) سے بڑھتی ہوئی بے چینی اور مایوسی ایران کی یونیورسٹیوں میں گرم مباحث کا باعث بنی ہے۔ محدود سیاسی حق انتخاب کی بنا پر، سروش جیسے دانشوروں اور مصلحین کے دلیرانہ خیالات کو تازہ آئیڈیاز کے طور پر خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ اور شائد تدریجی طور پر موجودہ طرز حکومت کے متبادل کے طور پر تحریک ملتی ہے۔

حکومتی دباؤ

حکومت نے بتدریج دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ چھ سال سے مسجدوں میں دیے جانے والے خطبات، ۱۹۹۴ء میں اسوقت اختتام پذیر ہو گئے جب سروش کو ایسے مقام کی تلاش مشکل ہو گئی جہاں بغیر مداخلت کے لیکچر دیا جاسکے۔ جون ۱۹۹۵ء میں اصفہان میں خصوصی لیکچر کے انعقاد میں بہت سی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ پہلے یونیورسٹی نے سہولیات کے استعمال کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔ جب طلبہ نے ایک پرائیویٹ ہال کا بندوبست کیا تو وہاں حکومتی حمایت یافتہ مسلح افراد نے ابتری پھیلائی، کرسیاں الٹ دی گئیں، جھگڑے میں کئی طلبہ زخمی ہو گئے۔ سروش نے ایک تہ خانے میں پناہ لی لیکن وہ پکڑ لیے گئے۔ انہیں مارا پیٹا گیا، کپڑے پھاڑ دیے گئے۔ اسی طرح دو اور مواقع پر سروش کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا، اور بھاگ جانے پر مجبور کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۹۵ء میں تہران یونیورسٹی میں ایک شدید جھگڑے کے بعد جس میں کئی طلبہ اور سروش خود بری طرح زخمی ہوئے، سروش کے حمائتیوں نے یونیورسٹی میں ایک احتجاج منظم کیا۔ انقلاب کے بعد یہ پہلا احتجاج تھا۔

اعلیٰ سرکاری افسروں نے بھی کھلے عام سروش کے خلاف سخت زبان استعمال کرنی شروع کردی۔ وزیر خارجہ علی اکبر ولایتی نے ایک پریس کانفرنس میں سروش پر حکومت کی خارجہ پالیسی میں روڑے اٹکانے کا الزام لگایا۔ انہوں نے کہا کہ سروش قومی آزادی کی بنیادوں، امن وامان اور ریاست کو کمزور کررہے ہیں۔ اور قومی اور نظریاتی بنیادوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

جب بھی ایک بے غرض حق گو اپنے کرب کو بیان کرتا ہے اور صرف مذہبی اصلاحات

کی خاطر، تو اسے اسکی شہرت، آزادی اور حفاظت سے محروم کیا جاتا ہے۔ گالیاں دی جاتی ہیں، ہراساں کیا جاتا ہے، مسجدوں، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ وہ کسی بھی سمت جانے کے قابل نہیں رہتا۔ اس پر بھی جب اسے روکا نہیں جاسکتا تو دن دیہاڑے اس پر حملے کرائے جاتے ہیں تاکہ پھر اس کے نیم مردہ جسم سے جو کچھ باقی بچ رہے اسے نوچا کھسوٹا جاسکے۔ ایذا رسانی کا یہ سلسلہ ۱۹۹۶ء کے آغاز میں زیادہ تیز ہو گیا۔ مسلح نوجوانوں نے اسے لیکچر دینے سے روکا۔ اسے موت کی دھمکیاں دی گئیں۔ گزشتہ سال [۱۹۹۶ء] میں ایک کھلے خط میں انصار حزب اللہ نے اس پر الزام لگایا کہ سروش فلسفے کی تعلیم نہیں دے رہا بلکہ ''لادینیت اور فحاشی کی ترغیب دے رہا ہے''۔

یہ کہا گیا کہ ''سروش اپنے کج رو اور غیر منطقی خیالات کے ذریعے یونیورسٹی کے نوجوان طبقے کو یقین سے تشکیک اور ابہام کی طرف لے جا رہا ہے''۔ . . امریکہ اور اسرائیل اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ اگر وہ ایران کے اسلامی نظام حکومت کی بنیادوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں تو انہیں اس کے [سروش کے] خیالات سے زیادہ کسی بڑے ہتھیار کی ضرورت نہیں۔ وہ خیالات جن کا جھوٹ ایران کی مسلم قوم کی تاریخ میں بارہا ثابت ہو چکا ہے۔ . . . ہم اپنے انقلاب کے نظریات سیکولرزم کو چنے کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی اپنے شہیدوں کا خون فروخت کرنے کے لیے''۔

تبدیلی کا محرک؟

سروش نے ایرانی صدر ہاشمی رفسنجانی کو خط میں لکھا: ''میں ایک یونیورسٹی کی موت پر افسردہ ہوں، جہاں تعلیم مر چکی ہے اور بربریت کی پیدائش پر خوشی منائی گئی ہے . . . وزارت اطلاعات نے دھمکیوں، رکاوٹوں اور اکثر بلاووں (سمن) کے ذریعے میری مصروفیات کو محدود کر دیا ہے۔ اور میرے انسانی حقوق کو پائمال کیا ہے . . . کب تک اس سرزمین میں دانشوروں کو پریشر گروپس کی قانون شکن سرگرمیوں کو برداشت کرنا ہوگا . . . ملک اس وقت ایسے مقام پر پہنچ چکا ہے۔ جب ایک پروفیسر کو کلاس پڑھانے کے لیے اپنے آپ کو موت کے لیے تیار کرنا پڑتا ہے''۔

ایران میں محدود ترجیحات اور زندگی کو لاحق خطرے کے پیش نظر سروش نے ۱۹۹۶ء میں ترکی، مصر، انگلینڈ، کینیڈا، آسٹریلیا اور امریکہ میں خطبات کے دعوت نامے قبول کر لیے۔ اس کے سامعین میں مسلمان طلبہ اور ایرانیوں کی اکثریت رہی۔ دس ماہ کے اس دورے میں

انہوں نے بڑی اور اہم شخصیات سے ملاقاتیں بھی کیں۔ اس خطرے کے باوجود کہ ان پر بیرونی رابطوں کا الزام لگایا جائے گا۔ اپریل ۱۹۹۷ء میں وہ اپنے کام پر ایران واپس آ گئے۔

ایک فلاسفر کے طور پر جو عموماً کتابوں کے بوجھ تلے دبا ہوا یا اپنے لیکچر لکھتے ہوئے ملتا ہے، سروش ایران میں متبادل سیاسی قوت نہیں، اس نے کسی بھی سطح پر سیاست میں آنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ اس کی نظر زیادہ وسیع ہے۔ اس کی نظر میں محوں کا نہیں صدیوں کا حساب ہے۔ لیکن وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے جھجکتا ہے کہ اس کا کام تبدیلی کا محرک ہے۔